

تصور توحید: فکر و عمل کے لیے مضمرات

ڈاکٹر اسماعیل راجی الفاروقی (شہید)

ترجمہ: پروفیسر عبدالقدیر سلیم

موجودہ دور میں اسلام کے فکری احیاء کے لیے کام کرنے والوں میں ڈاکٹر اسماعیل راجی الفاروقی (۱۹۸۶ء-۱۹۲۱ء) نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے امریکہ میں انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک سٹڈیز (IIIT) قائم کیا جس کی اس میدان میں نمایاں خدمات جاری ہیں۔ ان کی کئی کتابیں ہیں۔ ان کی کتاب: *Al Towheed: Its Implications for Thought and Life* زیر ترجمہ ہے۔ یہاں اس سے ماخوذ ایک تحریر پیش کی جا رہی ہے۔ (ادارہ)

- نہ تشکیک اور نہ عیسائیوں کا ”عقیدہ“

آج کی دنیا میں، خصوصاً مغرب میں تشکیک کا نقطہ نظر بہت مقبول ہوا ہے، اور خوب پھولا پھلا ہے۔ پڑھ لکھے لوگوں نے تو اسے ایک غالب فلسفے کے طور پر قبول کر لیا ہے، مگر اکثر ناخواندہ بھی اس کا شکار نظر آتے ہیں، کیوں کہ وہ اپنے اپنے معاشروں کے ”دانش وروں“ کی پیروی ہی کو مناسب خیال کرتے ہیں۔ تشکیک کے اس وسیع پیمانے پر فروغ کی ایک وجہ تو سائنس کی وہ کامیابی ہے، جسے مذہبی ذہن اور سوچ کے مقابلے میں تجربی فکر کی مسلسل فتوحات کے تناظر میں دیکھا جاتا ہے۔ مذہبی ذہن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ چرچ [عقیدے، ایمانیات] سے وابستگی کا نام ہے۔ تجربین کے نزدیک مذہب تو ایک عرصہ ہوا کہ حق و صداقت کی تعلیم و تلقین کا اختیار گنوا بیٹھا ہے اور چرچ اس اختیار کا سزاوار بھی نہ تھا، کیوں کہ اس کی پوزیشن ہمیشہ ہی اذعان رہی: وہ ایسے دعووں کو عقائد اور ایمانیات کے طور پر پیش کرتا رہا ہے، جنہیں کبھی تجربی جانچ پڑتال کی کسوٹی اور تنقید کے امتحان سے نہیں گزرا گیا۔ مغربی دنیا، اور اس کے سارے مقلدین ابھی تک عیسائی چرچ پر سائنسی فکر کو فتور کرنے کی کوششیں کر رہے ہیں، اس لیے اس کے زیر اثر وہ اس غلط اور

دُہری تعلیم تک جست لگا دیتے ہیں کہ چوں کہ تمام مذہبی علم لازمی طور پر اذعاناً ہے [اس لیے قابل ردّ ہے] اور [اس لیے صداقت تک رسائی کے لیے تمام راہیں تجربیت ہی سے ہو کر گزرنی چاہئیں] اور ان کی توثیق حسی تجربات ہی کے ذریعے ہونی چاہیے جو منضبط تجربے کے نتیجے میں حاصل ہوں۔ انھیں یہ فیصلہ کرنے میں کچھ دیر نہیں لگتی کہ ہر وہ بات جس کی اس طرح توثیق نہیں ہو جاتی، مشکوک ہے۔ مزید یہ کہ اگر وہ اس طرح قابل توثیق نہیں تو وہ لازماً غلط ہی ہے۔

اس طرح اُن کی نظر میں ہر مذہبی دعویٰ یا عقیدہ ایک ایسے نظریے سے وابستگی کی نشان دہی کرتا ہے جو تجربی طور پر ناقابل توثیق اور نتیجتاً بالکل بے وقعت ہے۔ صداقت نامعلوم ہے، اور اس کا علم ہو بھی نہیں سکتا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایمان و ایقان ایک عمل کے نام ہیں، یہ ایک فیصلے کی غمازی کرتے ہیں، جس کے ذریعے کوئی شخص ایک دشوار اور ناقابل عبور امر کو تسلیم کر لینے کا تہیہ کر کے چلتا ہے۔^(۱) پاسکل اُسے ”بازی کی ایک شرط“ یا داؤ کے طور پر پیش کرتا ہے، جس کی قطعیت داؤ لگانے والے سے ہمیشہ گریزاں ہی رہتی ہے۔

عیسائیوں کے درمیان لاندہب لوگوں نے عیسائی عقیدے کی تصویر کشی یوں کی ہے کہ یہ ایک اندھیرے کمرے میں اندھے شخص کا اُس کالی بلی کی موجودگی پر یقین ہے جو وہاں موجود ہی نہیں۔ انیسویں صدی میں جب سائنسی فتوحات کا نشہ اپنے عروج پر تھا، ایک جرمن عالم دینیات ہلمیر ماخر (Schleiermacher) نے ”مذہب سے عناد رکھنے والوں“^(۲) کے جواب کے طور پر اپنے عیسائی ساتھیوں کو یہ نصیحت کی تھی کہ عیسائی عقیدے کی صداقت کو امر واقعہ کی میزان میں نہ تولیں اور نہ حقیقت کو تنقید کی کسوٹی پر رکھنے کی کوشش کریں، اسے تو بس ایک موضوعی تجربے کے طور پر قبول کر لیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ یورپی شعور پر رومانیت کے انقلاب نے پوری طرح تسلط پالیا ہے۔ اس رومانی فکر کے مطابق خدا کو اپنے حقیقی وجود کے اثبات کے لیے عقیدہ رکھنے والے کی محسوسات ہی پر انحصار کرنا ہوگا۔

یہی وجہ ہے کہ مسلمان کو اپنے ایمان کے لیے ”belief“ یا ”faith“ کے الفاظ استعمال نہیں کرنے چاہئیں۔ آج کل اپنے عمومی مفہوم میں یہ انگریزی الفاظ عدم صداقت، ظن و قیاس، شک اور بے اعتمادی کا رنگ لیے ہوئے ہوتے ہیں جو اُن کے مفہوم سے لازماً مُترشح ہوتے ہیں۔ ان میں صداقت اُسی وقت تصور کی جاتی ہے جب وہ کسی مخصوص شخص یا گروہ کے حوالے سے استعمال ہوتے ہیں اور اس صورت میں بھی ان کا مطلب بس یہی ہوتا ہے کہ وہ مخصوص شخص یا گروہ کسی قضیے کو درست مانتے ہیں۔ مگر ان دونوں انگریزی الفاظ کا یہ مطلب نہیں کہ ہم یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ ”ایمان“ کی

اصطلاح کے بالکل متضاد ایک تصور ہے۔ یہ اصطلاح جو ”امن“ کے مادے سے مشتق ہے، اپنے اندر حفاظت کا مفہوم رکھتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ جن قضایا پر محیط ہے، وہ حقیقتاً درست بھی ہیں، اور یہ کہ ان کی صداقت کو ذہن نے قبول بھی کر لیا (یعنی اچھی طرح سمجھ لیا اور تسلیم کر لیا) ہے۔

عرب کے محاورے میں ایک شخص ”کاذب“ (دروغ گو) یا ”منافق“ (دھوکے باز) تو ہو سکتا ہے، مگر ایمان اس مفہوم میں غلط نہیں ہو سکتا کہ اس کا معروض وجود ہی نہ رکھتا ہو یا یہ اپنے معروض کے علاوہ کسی اور شے کے لیے استعمال ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ایمان اور یقین ہم معنی الفاظ ہیں۔ یقین کی کیفیت سے پہلے کوئی شخص حقیقت کا انکار کر سکتا ہے یا اس پر اعتراض کر سکتا ہے۔ مگر جب یہ یقین آ موجود ہوتا ہے، تو صداقت ایسی ہی محکم اور یقینی ہو جاتی ہے جیسے حسی شہادت۔^(۳) یہ ناقابل تردید مسلمہ حقیقت بن جاتی ہے۔ اب وہ شخص جو اب بھی شک میں مبتلا ہے اُسے یہی کہا جاسکتا ہے کہ ہاتھ لنگن کو آرسی کیا؟ اب تم خود ہی دیکھ لو۔ یوں دیکھیں تو یقین صرف صداقت ہی کا ہو سکتا ہے۔ وہ امر مسلمہ ہوتا ہے، ناقابل تردید۔ اس طرح ایمان نام ہے پختہ یقین کا: یہ تذبذب، شک، قیاس آرائی اور غیر یقینیت سے قطعی طور پر مبرا ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسا عمل، فیصلہ یا ارادہ نہیں، جس میں کوئی انسان اپنا اندھا اعتماد کسی ایسی چیز پر کر رہا ہو جس کے بارے میں اُسے یقینی طور پر معلوم نہ ہو۔ ایک مذہب آدمی تو ہمیشہ اس غلطان میں مبتلا رہتا ہے کہ اپنا سرمایہ اس خانے میں رکھوں یا اُس دوسرے میں۔ ایمان ایک واردات ہے، جو کسی شخص پر وقوع پذیر ہوتی ہے اور یہ تب ہوتا ہے جب کسی چیز کی صداقت اس کا امر واقعہ ہونا بغیر کسی شک کے اس کے یوں سامنے آ جاتا ہے کہ اس کے درست ہونے میں کسی طرح کے شک کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔ علم ہندسہ کے نتائج کی طرح کہ اگر ہم ابتدائی مقولات اور قضایا کو درست تسلیم کر کے چلیں، تو اُن کے نتائج کے درست ہونے میں کوئی شک نہیں ہوتا، ایمان کی صداقت اور اس کا لابدی ہونا بھی ناگزیر ہوتا ہے۔ قرآن کا استدلالی طریق بھی یہی ہے: جس شے میں لوگوں کو شک ہوتا ہے وہ اُسے ناظرین کے سامنے اس طرح لے آتا ہے گویا وہ اُسے دیکھ رہے اور محسوس کر رہے ہیں۔^(۴)

اسلام کا ایمان، عیسائیوں کے ایمان / عقیدے (faith) سے یوں بھی مختلف ہے کہ اس میں صداقت، ذہن کو تقویض کی جاتی ہے، اس کی باور کرنے کی صلاحیت کو نہیں آزمایا جاتا۔ ایمان کی صداقتیں اور مقولات اپنی ماہیت کے اعتبار سے تنقیدی اور معقول ہیں۔ یہ کوئی پُراسرار، ناقابل یقین، علم کی رسائی سے ماورا اور نامعقول دعوے نہیں ہیں۔ انھیں شک کی کسوٹی پر پرکھا جا چکا ہے، اور جانچ پڑتال سے اس عمل سے وہ سرخ رُو نکلے ہیں۔ اُن کی طرف سے اب کسی مزید وکالت کی ضرورت نہیں ہے۔ اب جو شخص بھی

انہیں تسلیم کر لیتا ہے، وہ ایک معقول انسان ہے، اور جو بھی اُن کے انکار پر اڑا رہتا ہے، یا اپنے شکوک کو ترک کرنے پر آمادہ نہیں، وہ نامعقول رویے پر قائم کہا جاسکتا ہے۔ مگر اس کی تعریف ہی کی رو سے عیسائی عقیدے کے بارے میں یہ بات نہیں کہی جاسکتی، ہاں اسلام کے ”ایمان“ کی یہ لازمی خصوصیات ہیں، جن کو بیان کیے بغیر اس کی تعریف کا حق ادا نہیں کیا جاسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے اسلام کی صداقت کو ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے: (اس دُئی کے ذریعے) حق ظاہر ہو چکا ہے۔ کذب اور باطل پسپا ہو گیا، اور اسے ایسا ہونا ہی تھا..... دانائی اب واضح طور پر سامنے آچکی ہے، باطل کا تو معاملہ ہی الگ ہے۔^(۵) اسلام کی معقولیت ہی یہ ہے کہ وہ تنقیدی ذہن کو مطمئن کرنے کی پوری پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ اسلام اس بات سے ہرگز خوف زدہ نہیں کہ اس کے مزعومات کے خلاف کوئی شواہد سامنے آ جائیں گے، وہ کسی خفیہ کارروائی کا قائل نہیں، اس کی اپیل یہ بھی نہیں کہ تمہارے کسی اندرونی احساس کی اس سے تسکین ہوتی ہے، کوئی ”اندرونی“ شبہات کا ازالہ ہوتا ہے، اور حقیقت کے برخلاف ہی سہی، کسی تشویش یا خواہش کی آرزوؤں کی اس سے تکمیل ہوتی ہے۔ اسلام کا دعویٰ تو ظاہر و باہر ہے۔ وہ عقل کو اپیل کرتا ہے، اور اُسے صداقت پر مطمئن کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اُسے سمجھ میں نہ آنے والے معنوں میں الجھانے اور ذہن کو ان سے مغلوب کرنے کی کوئی کوشش نہیں کرتا۔^(۶) اُسے اس عقیدے کے قبول کرنے پر آمادہ کرتا ہے، جو معقولیت اور سمجھ کی ہر جانچ پر پورا اترتا ہے۔^(۷)

۲- ایمان، ایک عرفانی تی درجہ

مندرجہ بالا تاملات سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ایمان کو محض ایک اخلاقی درجہ بندی میں محدود نہیں کیا جاسکتا۔ سچ تو یہ ہے کہ اولاً اس کا تعلق ”آگاہی اور علم کی جماعت سے ہے۔ گویا اس کا وظیفہ علم ہے، اس کا تعلق اس کے قضایا کی صداقت سے ہے۔ اور چوں کہ اس کے قضایا کے مشتملات بھی وہی ہیں، جو منطق اور علم کے ہیں، مابعد الطبیعیات کے ہیں، اور اخلاقیات اور جمالیات کے ہیں، اس لیے لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس کا وظیفہ ایک ایسی روشنی کا سا ہے، جو ہر شے کو منور کرتی ہے۔ غزالی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ ایمان ایک ایسی بصیرت ہے، جو تمام مواد اور حقائق کو اُن کے ٹھیک ٹھیک تناظر میں رکھ دیتی ہے اور ان کی درست تفہیم کے لیے یہ نہایت ضروری بھی ہے۔^(۸) یہ کائنات کی عقلی توجیہ کی اصل بنیاد ہے۔ عقل کا بنیادی اصول فی نفسہ غیر عقلی یا نامعقول نہیں ہو سکتا، اور یوں خود اپنا متضاد نہیں ہو سکتا۔ یہی تعقل کا اولین تقاضا ہے۔ اس کا انکار کرنا، یا اس کی مخالفت کرنا گویا معقولیت سے عاری ہو جانا ہے اور اس طرح کا شخص انسانیت کے درجے

التوحید بطور اصول علم اس امر واقعہ کو تسلیم کر لینے کا نام ہے کہ اللہ --- الحق (سچائی، صداقت) --- ہے اور یہ کہ وہ ایک ہے۔ یہ امر اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ تمام دعوے، تمام شکوک، اُسی کے حوالے سے دیکھے جانے چاہئیں۔ کوئی دعویٰ، کوئی حتمی فیصلہ بھی جانچ پڑتال سے ماورا نہیں۔ التوحید پر ایمان اس بات کو تسلیم کر لینے کے مترادف ہے کہ صداقت کی فی الواقع معرفت ہو سکتی ہے اور انسان اس تک رسائی کی استطاعت بھی رکھتا ہے۔ تشکیک جو اس صداقت سے انکاری ہے، التوحید کی ضد ہے۔ یہ صداقت کی تلاش اور جستجو کے عمل کو اس کے منطقی انجام تک پہنچانے میں ہمت و حوصلے کی کمی کا نام ہے۔ یہ منزل پر پہنچنے سے پہلے ہی راستے میں تھک کر بیٹھ جانے کا نام ہے کہ صداقت تک رسائی ہو ہی نہیں سکتی۔ ایک علمیاتی اصول کے طور پر یہ ایک مایوسی کا رویہ ہے، گویا یہ بات پہلے ہی تسلیم کر لی گئی ہے کہ انسان ایک خواب مسلسل کی حالت میں ہے، جہاں کبھی بھی حقیقت کو غیر حقیقت سے تمیز نہیں کیا جاسکتا۔ اس کو لاوجودیت کے فلسفے سے جدا نہیں کیا جاسکتا، جو سرے سے تمام اقدار ہی کا انکار کر دیتا ہے، کیوں کہ اقدار شناسی کا مطلب ہی یہ ہے کہ انسان کو اقدار کی صداقت تک پہنچنے کا اہل تسلیم کر لیا گیا ہے۔ جس چیز کو قدر کے طور پر تسلیم کیا جا رہا ہے کیا وہ فی الواقع ایسی ہی ہے؟ ایک مخصوص صورت حال میں کیا وہ قدر تکمیل کو پہنچ رہی ہے یا اُسے برباد کیا جا رہا ہے؟ اور وہ مخصوص صورت حال کیا وہی ہے جسے بیان کیا جا رہا ہے؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے بغیر کسی اقداری دعوے کی جانچ اور تصدیق نہیں ہو سکتی۔ جب تک یقین کے ساتھ ان کا جواب دینا ممکن نہ ہو، یعنی ان کی صداقت کا ٹھیک ٹھیک علم نہ ہو، اقدار کا علم اپنی بنیادوں پر قائم نہ رہ سکے گا۔ کسی قدر کی قدریت اور کسی مخصوص صورت حال میں اس کے انطباق پر تو شک کیا جاسکتا ہے کہ اس طرح کا شک ہر طرح کے مواد پر ہو سکتا ہے۔ اس لیے جب تک ایک انسان تشکیک کے مفروضے کو سچ کر نہیں ٹھکتا، جب تک آغاز سفر ہی میں وہ یہ مان کر نہیں چلتا کہ ان امور میں صداقت تک رسائی ممکن ہے اس وقت تک وہ لاوجودیت کے چنگل سے نہیں بچ سکتا۔

۳۔ وحدانیتِ اللہ اور وحدانیتِ صداقت

اللہ کی اُلُوہیت اور اس کی توحید کو تسلیم کرنا دراصل صداقت اور اس کی وحدت کو تسلیم کرنا ہے۔ اُلُوہی وحدت اور وحدتِ صداقت ایک دوسرے سے جدا نہیں کیے جاسکتے۔ یہ بات اس وقت بالکل واضح ہو جاتی ہے جب ہم اس امر پر غور کرتے ہیں کہ التوحید --- یعنی یہ اقرار کہ اللہ ایک ہے --- کا ایک وصف ہی صداقت ہے۔ کیوں کہ اگر صداقت ایک سے زیادہ ہوتی، تو یہ بیان کہ ”خدا ایک ہے“ بھی درست ہوتا اور یہ بیان کہ ”کوئی اللہ“ بھی درست ہوتا۔
 @ rasailojaraid.com یہ کہنا کہ صداقت ایک ہے نہ

صرف یہ اقرار کرنا ہے کہ اللہ ایک ہے، بلکہ ساتھ ہی یہ بھی اقرار کرنا ہے کہ سوائے اللہ کے کوئی خدا [معبود] اللہ نہیں۔ یہی انکار اور اقرار کا وہ اتصال ہے جس کا اظہار کلمہ شہادت میں ہوتا ہے: لا الہ الا اللہ!

طریقہ یقینی اصول کی حیثیت سے دیکھیں، تو التوحید تین اصولوں پر مشتمل ہے: اولاً اُس سب کا انکار جو حقیقت سے مطابقت نہیں رکھتا، ثانیاً غائی تضادات کا انکار اور ثالثاً نئی اور یا متضاد دلیل کے لیے ذہن کو کھلا رکھنا۔ پہلا اصول، کذب اور فریب کو اسلام سے خارج کر دیتا ہے، کیوں کہ وہ مذہب کی ہر بات کو تفتیش پر تال اور تنقید کے لیے کھلا رکھتا ہے۔ اس حقیقت سے انحراف یا اس سے عدم مطابقت، اسلام میں کسی بھی چیز کو باطل کر دینے کے لیے کافی ہے۔ چاہے کوئی قانون ہو، ذاتی یا اجتماعی اخلاقیات کا کوئی اصول ہو یا کائنات کے بارے میں کوئی بیان، ہر چیز تفتیش و تنقید کے لیے کھلی ہوئی ہے۔ پھر یہ اصول، اہل اسلام کو ’رائے‘ کی دست و برد سے محفوظ رکھتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ علم (یقینی) کا کوئی دعویٰ بغیر جانچ پڑتال اور وثوق کے نہیں کیا جاسکتا۔ قرآن واضح الفاظ میں اعلان کرتا ہے کہ ہر بلا تحقیق دعویٰ ظن (فریب علم) ہے، اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک ممنوع^(۹) قطع نظر اس کے کہ بات کتنی ہی چھوٹی ہو۔ مسلم کی تعریف یوں کی جاسکتی ہے کہ وہ ایک ایسا انسان ہے جو صداقت کے بغیر کوئی دعویٰ نہیں کرتا، وہ حق ہی کو پیش کرتا ہے، چاہے اس میں اس کی اپنی ذات کے لیے کتنے ہی خطرات مضمر ہوں۔ منافقت اور مکر و فریب، بیچ اور جھوٹ کا آمیزہ تیار کر لینا، سچ / صدق کو اپنے ذاتی مفاد یا اپنے عزیزوں کے مفاد سے کم تر حیثیت دینا، اسلام میں اتنے ہی قابل نفرت ہیں، جتنے کہ قابلِ حقارت۔

دوسرا اصول یہ ہے کہ ایک طرف تو کوئی تضاد نہ ہو، اور دوسرے یہ کہ قضایا متناقض نہ ہوں۔^(۱۰) یہ اصول دراصل عقلیت کی روح ہے۔ اس کے بغیر تشکیک سے چھٹکارا نہیں مل سکتا۔ کیوں کہ ایک لانیل تضاد کا مطلب یہ ہوگا کہ دو متضاد قضیوں میں سے کسی ایک کی صداقت کا کبھی پتا ہی نہیں چل سکتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انسانوں کی فکر اور کلام میں کبھی نہ کبھی تضاد تو پایا جاتا ہے مگر سوال یہ ہے کہ آیا تضاد سے بچا بھی جاسکتا ہے یا نہیں۔ کیا ایسا اصول دریافت کیا جاسکتا ہے جو دونوں متضاد قضایا پر حاوی ہو، اور اس کی مدد سے ان کا تناقض رفع کیا جاسکے، اور اختلافات ختم کر دیے جاسکیں۔

یہ بات وہاں بھی درست ٹھہرتی ہے جب الہام اور عقل کے درمیان تضاد واقع ہوتا ہو، نظر آتا ہے۔ اسلام نہ صرف یہ کہ اس طرح کے تضاد کے منطقی امکان کا انکار کرتا ہے، بلکہ اس زیر بحث دوسرے اصول کے ذریعے اس طرح کے تضاد کے وقوع کی صورت میں اس کے حل کے لیے مناسب ہدایات بھی فراہم کر دیتا ہے۔ نہ تو یہ عقل کے لیے سزاوار ہے کہ وہ الہام سے بالادستی کا دعویٰ کرے، اور نہ الہام کو ایسا کرنا

چاہیے۔ اگر صرف الہام ہی کو غیر مشروط فوقیت حاصل ہو تو کوئی ایسا اصول باقی نہ رہے گا جو ایک الہام کو دوسرے سے متمیز کر سکے یا الہام کے دو مختلف دعوؤں کے درمیان فرق کر سکے۔ اس طرح دو بیانات یا الہامی ہونے کے دعوے دار دو موقفوں کے الفاظ کے درمیان سادہ تضادات، اختلافات یا ظاہری عدم تطابق بھی اس طرح حل نہیں ہو سکیں گے۔ یہ بات واضح ہے کہ کوئی الہام خود کو اپنے آپ سے ہم آہنگ کرنے کے وسائل سے محروم نہیں کر سکتا کہ اسی طرح اس کا اپنا مکان درست حالت میں رہ سکتا ہے۔ مگر ایک دوسری صورت حال یہ بھی ہے کہ الہام، عقل کے خلاف۔۔۔ یعنی عقلی جانچ پڑتال اور شعور کے خلاف۔۔۔ بھی ہو سکتا ہے۔ جہاں بھی ایسی صورت حال پیدا ہو، اسلام دعویٰ کرتا ہے کہ تضاد حقیقی اور غائی نہیں ہے۔ پھر وہ تفتیش کنندہ کو اس بات پر آمادہ کرتا ہے کہ وہ الہام کی اپنی تفہیم پر نظر ثانی کرے یا اپنے نتائج عقلی پر یاد دہانی دے۔

التوحید تضاد کے غائی ہونے کو رد کر کے صداقت کی وحدت ہونے کے ناتے ہم سے یہ مطالبہ کرتی ہے کہ متضاد دعوؤں کو پھر سے دیکھیں اور دوبارہ ان کی چھان بین کریں۔ وہ یہ مان کر چلتی ہے کہ اس مسئلے کا کوئی پہلو ایسا ضرور ہے جس پر کما حقہ غور نہیں کیا جا سکا ہے اور اگر اس پر غور کر لیا جائے تو متناقض دعوے ایک گل میں ضم ہو جائیں گے۔ ساتھ ہی التوحید ہم سے یہ مطالبہ کرتی ہے کہ الہام کو نہیں بلکہ الہام کے قاری کو ایک مرتبہ پھر اس الہام کے مطالعے کے لیے کہا جائے کیوں کہ ہو سکتا ہے کہ کوئی غیر واضح اور غیر صریح معانی اس کی نظر میں آنے سے رہ گئے ہوں اور دوبارہ غور و فکر سے یہ تضاد رفع ہو جائے۔ عقل اور فہم کی طرف اس رجوع کا مقصد خود الہام میں کسی طرح کی ہم آہنگی پیدا کرنا نہیں کیوں کہ الہام تو ہر طرح کے انسانی جوڑ توڑ اور کارستانیوں کی آماجگاہ ہونے سے کہیں بلند ہے۔ اس کا مقصد تو صرف یہ ہے کہ ہماری انسانی تفہیم میں آہنگ پیدا ہو جائے۔ اس سے ہوتا یوں ہے کہ عقل نے اب تک جن شواہد کا ذخیرہ جمع کر لیا ہے الہام کی ہماری فہم اس کے مطابق ہو جاتی ہے۔ اس کے برخلاف تناقض یا متضاد قضایا کو اپنی جگہ غائی طور پر درست سمجھ لینا ایک کمزور ذہن ہی کو بھاتا ہے۔ ایک مسلمان، عقل پر یقین رکھنے والا انسان ہوتا ہے کیوں کہ وہ صداقت کے دونوں مصادر۔۔۔ الہام اور عقل۔۔۔ کے اتحاد پر اصرار کرتا ہے۔

التوحید کا تیسرا اصول، صداقت کی یک جہتی ہے، یعنی نئے اور/یا متناقض شواہد کے لیے اپنے دروازے کھلے رکھنا۔ یہ اصول مسلمان کو لفظ پرستی، مذہبی انتہا پسندی اور جمود پیدا کرنے والی قدامت پرستی سے محفوظ رکھتا ہے۔ وہ اس میں دانش مندانہ انکسار کو پروان چڑھاتا ہے اور اس سے مطالبہ کرتا ہے کہ اپنے اقرار اور انکار کے ساتھ اللہ اعظم (اللہ بہتر جانتا ہے!) کے فقرے کا بھی اضافہ کرے۔ کیوں کہ اس کو پورا

یقین ہوتا ہے کہ صداقت اپنی کلی ہیئت میں اس کی اپنی فہم سے کہیں زیادہ وسیع اور بڑی ہے۔^(۱۱)

اللہ تعالیٰ کی مطلق وحدت کا اقرار کرتے ہوئے التوحید حق یا صداقت کے مصادر کی وحدانیت کا بھی اقرار کر رہی ہوتی ہے۔ انسان جس کائنات سے علم حاصل کرتا ہے اس کا خالق بھی اللہ ہی ہے۔^(۱۲) ہمارا معروض علم کیا ہے فطرت کی وہ یکسانیاں اور سانچے ہی تو ہیں جن کا بنانے والا خود اللہ تعالیٰ ہے۔^(۱۳) چونکہ اللہ ہی ان کا خالق ہے اس لیے بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ وہ ان کو جانتا بھی ہے۔ اور یہ بات بھی شبہ سے بالا ہے کہ الہام کا سرچشمہ بھی اُسی کی ذات ہے۔ وہ اپنے علم میں سے کچھ انسان کو بھی عطا کرتا ہے اور اس کا علم مطلق اور آفاقی ہے۔^(۱۴) اللہ تعالیٰ [نعوذ باللہ] کوئی چال باز یا بدخواہ/بد باطن عامل نہیں جس کا مقصد ہی لوگوں کو راستے سے بھٹکا دینا اور گمراہ کرنا ہو۔ اور پھر یہ بات بھی نہیں کہ انسانوں کی طرح جو اپنے علم کو ٹھیک کرتے رہتے ہیں اور اپنے ارادے اور فیصلے بدلتے رہتے ہیں اللہ بھی اپنے حکم اور فیصلے کو بدلتا رہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کامل ہے اور اس کا علم بھی کامل ہے وہ ہر شے کا علم رکھتا ہے۔ وہ غلطیاں نہیں کرتا۔ اگر یوں ہوتا تو وہ اسلام کا خداے قدوس۔۔۔ ہر شے سے ماوراء معبود۔۔۔ نہ ہوتا۔

۴۔ رواداری

التوحید اس بات کو تسلیم کر لینے کا نام ہے کہ صرف اللہ ہی معبود یا ”الہ“ ہے۔ ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ اس بات کو مان لینے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ تمام خیر اور تمام اعلیٰ اقدار کا اصل مصدر [سرچشمہ] ہے۔ اس لیے اس کا اعلان کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ ہی کو غائی خیر تصور کیا جا رہا ہے یعنی وہ اعلیٰ ترین خیر جس کی وجہ سے خیر کی حامل ہر شے خیر بنتی ہے۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہی خیر کو اس کے خیر ہونے کا وصف اور قدر کو اس کی صفتِ قدر عطا فرماتا ہے۔ غائی خیر کے سرچشمے میں خیر کی صفت پر کبھی شک کیا ہی نہیں جاسکتا ہمیں ہمیشہ یہ مان کر ہی چلنا چاہیے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے جو امر بھی مقدر فرمایا ہے اس نے ایک اچھے مقصد ہی کے لیے یہ مقدر کیا ہے اور یہ مقصد بھی اُسی کی ذات کا متعین کردہ ہے۔ اس کے برخلاف کوئی رائے رکھنا فی الاصل التوحید ہی کا انکار کر دینا ہے۔ اسی لیے قرآن مجید نے زور دے کر یہ بات کہی ہے کہ مسلمانوں کو اللہ کے بارے میں کسی برائی کا خیال بھی نہ لانا چاہیے۔^(۱۵) قرآن نہایت واضح الفاظ میں اُن لوگوں کی مذمت کرتا ہے جو اس طرح کے خیال میں مبتلا ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اذیت اور دکھ دینے یا گمراہ کرنے کے لیے نہیں تخلیق کیا نہ اس نے ہمیں علم ہماری جبلتیں اور خواہشیں ہی اس لیے عطا کی ہیں کہ ان قوتوں اور صلاحیتوں کے ذریعے ہمیں درست راستے سے بھٹکا دے۔ ہمارے حواس ہمیں جو خبر دیتے ہیں اُسے درست ہی سمجھنا چاہیے سوائے اس کے کہ واضح طور پر ہمارے حواس بگڑے ہوئے یا بیمار

ہوں۔ ہماری فہم عام کے نزدیک جو بات درست ہے، اُسے ٹھیک ہی سمجھنا چاہیے، سوائے اس کے کہ اس کے برخلاف ثابت ہو جائے۔ اسی طرح ہماری جہتوں اور خواہشات کی طلب بھی بنیادی طور پر خیر ہی ہوتی ہے، سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ ہی نے واضح طور پر اُن کی ممانعت کر دی ہو۔ التوحید، علمِیاتی اور اخلاقی سطحوں پر ہمیں رجائیت اور سرخوشی کی تلقین کرتی ہے۔ اسی کو ہم رواداری کہتے ہیں۔

ایک علمِیاتی اصول کی حیثیت میں رجائیت، حال کو، جیسا کہ وہ ہے، قبول کر لینے کا نام ہے، جب تک کہ اس کا باطل ہونا ثابت نہ ہو جائے۔ ایک اخلاقی اصول کی حیثیت میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ خواہشات کا احترام کیا جائے، سوائے اس کے کہ اُن کا ناپسندیدہ ہونا ثابت ہو جائے۔^(۱۶) اول الذکر کو مساعد (۱) کہا گیا ہے اور ثانی الذکر کو یسنر (آسانی، رواداری)۔ یہ دونوں رویے مسلمان کو ساری دنیا کے لیے اپنے درپے بند کر لینے اور مردہ کر دینے والی قدامت پسندی سے بچاتے ہیں۔ یہ دونوں اُسے حیات کی تصدیق کرنے اور اس کی صدا پر لبیک کہنے اور نئے تجربات کے لیے آمادگی پر ابھارتے ہیں۔ یہ دونوں اُسے، نئے مواد کو اپنی عقل کی کسوٹی پر پرکھنے، اپنے تعمیری مشاغل پر تیار رہنے، اور اس طرح اپنے تجربے اور زندگی کو باثر بنانے پر آمادہ کرتے ہیں، اور اس طرح اُسے اپنی ثقافت اور تہذیب کو آگے بڑھانے میں مدد کرتے ہیں۔

التوحید کے جوہر کے دائرے میں بحیثیت ایک طریقِیاتی اصول کے رواداری دراصل یہ ایقان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی قوم کو ایک رسول یا پیغام بر کے بغیر نہیں چھوڑا ہے، جو انھیں کے درمیان سے مبعوث ہوتا ہے اور اس بعثت کی غرض و غایت انھیں یہ تعلیم دینی ہوتی ہے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے، اور یہ کہ انھیں اسی کی عبادت اور اُسی کی غلامی اختیار کرنی چاہیے۔^(۱۷) رسول انھیں شر اور اس کو وجود میں لانے والے عوامل سے بھی خبردار کرتا ہے۔^(۱۸) یوں دیکھیں تو رواداری اس تین کا نام ہے کہ تمام ایک احساسِ مشترک سے بہرہ ور کیے گئے ہیں، جس کی وجہ سے وہ سچے مذہب کا شعور حاصل کرتے ہیں، اور اسی کے ذریعے وہ اللہ کی مشیت اور اس کے احکام کو پہچان لیتے ہیں۔ یہ وہ عقیدہ ہے جو ہمیں بتاتا ہے کہ مذاہب کا سارا تنوع اور اختلاف، تاریخ کی پیداوار ہے، جس پر اثر انداز ہونے والے عناصر بہت سے ہیں: زمان و مکان کے بدلتے ہوئے عوامل، اس کے تعصبات، جذبات اور ذاتی مفادات ان میں سے چند ایسے عوامل ہیں۔ مذاہب کی ان مختلف النوع صورتوں کے پیچھے السدین الحنیف (اللہ کا اصل دین) ہی نظر آتا ہے، جس پر تمام انسان اصلاً پیدا ہوتے ہیں، اور پھر اپنا دین تبدیل کر کے کسی ایک یا دوسرے مذہب کے مقلد بن جاتے ہیں۔^(۱۹) رواداری تقاضا کرتی ہے کہ مسلمان، تاریخ (بصیغہ جمع) کا اس نقطہ نظر سے مطالعہ کرے کہ اُسے ہر جگہ اللہ تعالیٰ کی اصل اور اولین عطا کا شعور حاصل ہو سکے۔^(۲۰) یہ وہ عطا ہے، جس کی تعلیم و تلقین کے لیے اللہ

تعالیٰ نے تمام مقامات پر اور ہر زمانے میں اپنے رسولوں کو مبعوث فرمایا ہے۔ یہ مطالعہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس کے ذریعے اس اصل دین کی اہمیت پر زور دیا جاتا ہے، اور نہایت خوب صورت انداز میں نہایت مضبوط دلائل اور شواہد کے ساتھ لوگوں کو اس کی طرف دعوت دی جاسکتی ہے۔^(۲۱)

مذہب میں (اور یہ بات تو واضح ہے کہ انسانی رشتوں میں اس سے زیادہ اہم اور اولیت کی حامل کوئی دوسری شے نہیں ہے) رواداری، مذاہب کے درمیان محاذ آرائی اور باہمی خصامت و مذمت کو ایک عالمانہ تحقیق و تفتیش میں بدل دیتی ہے جس کے ذریعے مذاہب کے ظہور اور ان کی نشوونما کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے اور اس طرح اصل الہام کو اس کے تاریخی حشو و زوائد سے علیحدہ کیا جاسکتا ہے۔ اخلاقیات میں جو کہ دوسرا نہایت اہم میدان ہے، یسیر کا تصور مسلمان کو تمام حیات بیزار و رجحانات سے محفوظ رکھتا ہے اور تمام انسانی آلام اور مصیبتوں کے درمیان رجائیت کی اس کم سے کم مقدار کی ضرورت ضمنت دیتا ہے جو اس کی صحت، توازن اور احساس تناسب و موزونیت کے لیے ناگزیر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں یقین دلایا ہے کہ ”ہنگی اور بختی کے ساتھ سہولت و آسانی بھی ہے“۔^(۲۲) اور چون کہ اس نے ہمیں یہ حکم دیا ہے کہ فیصلہ کر لینے سے پہلے ہر دعوے کی اچھی طرح جانچ پڑتال اور تفتیش کر لی جائے،^(۲۳) اسی لیے اصولیون (علمائے فقہ و قانون) نے کسی بھی مطلوبہ چیز پر جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے واضح احکام نہیں ہیں، خیر یا شر کا فتویٰ لگانے سے پہلے اُسے اچھی طرح آزمائے لینے کا طریقہ اپنایا ہے۔

حواشی

- ۱- یہود ثبوت کے لیے معجزات طلب کرتے ہیں اور یونانی عقل کے جویا ہیں۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے، ہم مسیح مصلوب کی منادی کرتے ہیں۔ یہ وہ پیغام ہے جو یہود کے لیے بار خاطر [ناگوار] اور لمحہ دین کے نزدیک مہمل ہے۔ سینٹ پال: ۱ Corinithians ۲۲-۲۳

۲- Religion - Speeches to Its Cultural Despisers: Friedrich D. Schleiermacher

ترجمہ: John Oman (Harper & Brothers، نیویارک ۱۹۵۸ء) ص ۹۴ اور آگے۔

- ۳- کلا لو البیقین (التکافیر ۱۰۲: ۵-۷) ”[بات تو یہ ہے کہ اگر تم [صدقات کو] یقینی علم کے طور پر جان لینے، تو تم ضرور جہنم کا مشاہدہ کر لیتے اور پھر تم اُسے اس طرح دیکھ لیتے جیسے یقین کی آنکھ سے اُسے دیکھ رہے ہو۔“

- ۴- اسلام کے تصور ایمان اور پاسکل کے ”ایمان“ (faith) میں بڑا گہرا تفاوت ہے۔ پاسکل کے نزدیک ایمان ایک جوے کا داؤ یا بازی ہے جو اپنی مابینت کے اعتبار سے ہمیشہ غیر حتمی اور اُن جاننا ہی ہوتا ہے۔ اس کے خیال میں صورت حال یوں ہے کہ اللہ کے وجود کے بارے میں انسان کو کبھی شہودی قطعہ نصیب نہیں ہو سکتا، لہذا اُس کے احکام اور آخری فیصلے کے بارے میں اُس طرح کا یقین حاصل ہو سکتا ہے۔ مگر اسلام نے اس طرح کی برہان قاطع لانے کا جلیج قبول کر لیا۔ اسی لیے

مسلمانوں نے اس طرح کے عقلی عقیدے کے لیے ہر طرح کی دلیل سے کام لیا۔ تخلیق اور تعمیر پر مبنی دلائل، دلیل منصوبہ اور مقصدیت اور شعور اخلاق کی دلیل اپنی بہترین صورت میں قرآن مجید ہی میں ملتی ہیں۔

۵۔ وقل جاء الحق زهوقاً (بنی اسرائیل ۸۱:۷) ”[اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم] کہہ دیجیے کہ اب حق آچکا ہے (صدائق ظاہر ہو چکی ہے) اور باطل (غیر حق) مٹ گیا ہے اور باطل کو تو پسپا ہو ہی جانا ہے۔“ قد تبين الغی (البقرہ ۲۵۶:۲) ”صحیح بات غلط خیالات سے الگ چھانٹ کر رکھ دی گئی ہے۔“

۶۔ اسلام کی اس عقلیت پسندی واضح اور مین ثبوتوں کے سلسلے میں اس کے اصرار، علم اور دانائی سے اس کی وابستگی توصیف اور فروغ کی کوشش سائنس اور ساری کائنات میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے نمونوں کی دریافت کی سعی خواہ وہ آسمانوں میں ہوں یا نفس انسانی میں۔۔۔ ان سب کا موازنہ عیسائیت میں ایمان کے بیان سے کیجیے۔ (I Cornithians)

۷۔ I Cornithians ۱: ۲۰-۱

۸۔ ابو حامد الغزالی: المنقذ من الضلال (یونیورسٹی پریس دمشق ۱۳۶۷ھ/۱۹۵۶ء) ص ۶۲-۶۳۔ غزالی یہاں کہتے ہیں کہ ایمان عقل کی شہادت کا انکار نہیں کرتا نہ اس کی تردید کرتا ہے اور نہ اس کے خلاف جاتا ہے بلکہ اس کی توثیق کرتا ہے۔ ”..... میں نے اپنے شکوک کا علاج کرنا چاہا مگر شہادت عقل کے بغیر یہ ناممکن تھا تاہم بنیادی علوم [مابعد الطبیعیات] کے بغیر کوئی شہادت قائم نہیں رہ سکتی تھی۔ اور چونکہ ان علوم کی بنیادیں ہی محفوظ و مستحکم [اور شکوک سے بالا] نہیں تھیں اس لیے اُن کے نتائج اور اُن کی بنیادوں پر تعمیر ہونے والے نظریات بھی غیر مستحکم ہی تھے مگر بعد میں [ایمان کے تحت یا اس کے ساتھ]..... [سائنس اور مابعد الطبیعیات کی] یہ تمام عقلی بنیادیں مستحکم و محفوظ عقلی طور پر صحیح اور قابل قبول بن گئیں۔ علم میں ان کی بنیادوں نے ان کو پوری طرح سہارا دیا۔“ (ص ۶۲)

۹۔ یا ایہا الذین امنوا اثم (الحجرات ۱۲:۳۹) ”اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! اپنے ساتھیوں کے بارے میں [بہت زیادہ ظن و گمان سے بچو کیوں کہ تھوڑا سا شک و گمان بھی گناہ کے زمرے میں آتا ہے۔“

۱۰۔ اس نکتے کی مزید وضاحت اور تجربے کے لیے الحضارہ الاسلامیہ میں اس مصنف کا مضمون اور رد عمل ملاحظہ ہو (باب ۲، نوٹ ۱)۔

۱۱۔ وسع تتذكرون (الانعام ۸۰:۶) ”میرے رب کا علم تمام چیزوں پر محیط ہے تو پھر کیا تم اس پر توجہ نہیں دیتے؟ اللہ الذی علماً (الطلاق ۱۲:۶۵) ”وہ اللہ ہی ہے جس نے سات آسمانوں کو پیدا کیا ہے اور انھی کی طرح [سات] زمینوں کو بھی۔ اس کا حکم ان سب پر غالب آتا ہے۔ [اس لیے ہے کہ] تم جان لو کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے اور یہ کہ ہر شے اس کے دائرہ علم میں ہے۔“ ان بالمہتدین (الانعام ۱۱۷:۶) ”تمہارا رب بہتر طور پر جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بے راہ ہوتا ہے اور وہی اس بات کا بھی بہتر جاننے والا ہے کہ ٹھیک راستے پر چلنے والے (ہدایت یافتہ) کون ہیں۔“

۱۲۔ دنیا مظاہر یا فطرت کے بارے میں قرآن مجید کے بیان کے یہی معنی ہیں۔ اس کے مطابق یہ اللہ کی آیات، یعنی نشانیوں (نشانی کے لفظی معنی ہی اشاریہ یا شہادت کے ہیں) سے بھری پڑی ہیں۔ ان تمام مثالوں میں قرآن مجید اس استنتاج/ استدلال کی طرف اشارہ کرتا ہے جس کو فلسفہ کمال کمال و بالخصوص متعلقہ امور خالق کے درمیان تعلق کو واضح طور پر

۱۳- وفي الارض للمؤمنين (الذاریات ۵۱:۲۰) ”زمین میں اللہ تعالیٰ کی کاریگری کی نشانیاں موجود ہیں“

اللہ ہی ہے جس نے تمھارے لیے سورج کو روشنی اور چاند کو نور بنایا، اور اس نے اس کی منزلیں مقرر کر دیں، تاکہ اسے [ماہ

کے لیے اپنی نشانیوں کو واضح طور پر بیان کرتا ہے..... رات اور دن کے اختلاف میں، اور اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین پر

۱۴- ان الله عليمًا (النساء: ۳۲) ”اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے“ - وسع تتذكرون (الانعام: ۸۰)

(البقرہ ۲: ۳۱) ”اور [اللہ نے] اُن سب [چیزوں] کے نام سکھائے۔“ - الذي علم يعلم (العلق

تھا۔ ”ويعلمكم..... تعلمون (البقرہ ۱۵۱:۲)“ ”و تمہیں کتاب اور دانائی سکھاتا ہے“ اور تمہیں ان باتوں کا علم

۱۵- مصیبا (الفتح ۶:۴۸) ”وہ [اللہ] منافق مردوں اور منافق عورتوں (اسلام کا جھوٹا دعویٰ کرنے والوں)“

ساتھ براگمان رکھتے ہیں، عذاب دے گا۔ اُن پر برائی کی گردش مسلط ہوگئی ہے، اللہ ان سے ناراض ہوگیا ہے اور اس نے

۱۶- اسی اصول کی روشنی میں اسلام کے قانون سازوں نے قانون کی بنیاد کے طور پر یہ اصول اختیار کر لیا ہے کہ ”سوائے ان

۱۷- وما خلقت ليعبدون (الذاریات ۵۱: ۵۶) ”میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ

۱۸- وَلَقَدْ بَعَثْنَا الْمَكْذِبِينَ (النحل ۳۶:۱۶) ”اور ہم نے جرأت [انسانوں کے ہر گروہ] میں ایک رسول [بیغام

پھر اُن میں سے کچھ وہ ہیں جنہیں اللہ نے ہدایت دی، اور بعض وہ ہیں جن کی گمراہی ثابت ہو گئی۔ تم زمینِ رُحوم پھر کر اچھی

۱۹۔ ”میں اس لئے رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں کہ معتدل حنفیہ کی تعلیم دوں۔ اس سوال کے جواب کہ آپ [ماضی کے] انہا

ابراہیمی۔ اس حدیث کو حضرت ابن عباسؓ نے روایت کیا ہے (الزبیدی: تاج العروس، بذل "خف" ج ۶، ص ۷۸):

الامام مسلم بن الحجاج، حبيب العالمين، خلاصتنا من الظلم والظلمات
 © asailoiaraid.com ترتيب: محمد ناصر الدين الباني (كويت)

الدرار الکویتۃ للطباعة ۱۳۸۸ھ/ ۱۹۶۹ء) ج ۲ ص ۲۳۹، حدیث نمبر ۱۹۸۲ء۔

- ۲۰۔ فاقم يعلمون (الروم ۳۰:۳۰) ”پس تم اپنا رخ اصل دین کی طرف کر لو بالکل خالص ہو کر [یکسوئی کے ساتھ] یہ اللہ کی بنائی ہوئی وہ اصل فطرت ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں میں رکھ دیا ہے [یا جس پر اللہ نے سب انسانوں کو پیدا کیا ہے] اللہ تعالیٰ کی تخلیق میں کوئی تغیر نہیں ہو سکتا۔ یہی سیدھا اور سچا دین ہے، لیکن اکثر لوگ اس کا علم نہیں رکھتے۔“
- ۲۱۔ ادع بالمہتدین (النحل ۱۶:۱۲۵) ”اپنے رب کی طرف دانائی اور اچھی نصیحت کے ساتھ دعوت دو اور لوگوں کے ساتھ احسن طریقے سے جدال کرو۔ [یعنی اختلاف کا اظہار بھی خوبی اور سلیقے سے ہو]۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تمہارا رب اچھی طرح جانتا ہے کہ کون راہِ راست سے بھٹک گیا ہے اور وہ ہدایت یافتہ لوگوں کو بھی بخوبی جانتا ہے۔“
- ۲۲۔ یرید اللہ العسر (البقرہ ۱۸۵:۲) ”اللہ تعالیٰ تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے، وہ تمہیں تنگی اور سختی میں مبتلا کرنا نہیں چاہتا۔“
- ۲۳۔ یا ایہا الذین ندمین (الحجرات ۶:۴۹) ”اے اہل ایمان! اگر تمہارے پاس کوئی فاسق کوئی فاجر لے کر آئے تو اس کی [اچھی طرح] تحقیق کر لیا کرو ایسا نہ ہو کہ تم جہالت [غلط علم] کی بنا پر کسی قوم پر حملہ آور ہو جاؤ اور بعد میں تمہیں اپنے کئے پر پچھتانا پڑے۔“

حج کی تہ کی نہیں؟

حج کرنے والوں اور تہ کرنے والوں کے لیے

تحفہ حج

خصوصی لفافے میں ۵ کتابچوں کا سیٹ

قیمت: ۲۵ روپے زیادہ تعداد پر خصوصی رعایت

خود پڑھیے، شوق حج کو حرارت دیجیے

عازمین حج کو تحفہ دیجیے

نقد یا ڈرافٹ کے ساتھ آرڈر دیجیے۔ دی پی کی سہولت بھی موجود ہے

ہیڈ آفس: صفحہ ۱ منصورہ، ملتان روڈ، لاہور۔ فون: 5425356 فیکس: 7832194

کراچی: ڈسٹریکٹ بک سٹور، ۵/۵۷، بلاک ۵، گلشن اقبال۔ فون: 4967661